باب سوم

جدیدیت: مسائل اور امکانات

حضرت سلیمانؑ ایک بہت بڑے پیغمبر تھے۔ اُن کی حکومت نہ صرف انسانوں پر بلکہ جنوں اور پرندوں پر بھی قائم تھی۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں وہ اپنے نظام خیال کو جب پھیلا چکے تھے یا اللہ کا پیغام اللہ کے بندوں تک پہنچا چکے تھے، تو انہوں نے سوچا کہ سر بہ زانو رہنے سے بہتر ہے کہ بیت المقدس میں ایک عظیم الشان عبادت گاہ تعمیر کی جائے۔ مگر یہ کام انسانوں کے بس کا تو نہیں تھا، اس لئے حضرت سلیمانؑ نے جنات کو اس کام پر معمور کیا اور خود چونکہ بوڑھے ہو چکے تھے، اس لئے ایک عصا کا سہارا لے کر بہ نفس نفیس اس کی نگرانی کرنے لگے۔ عبادت گاہ دن رات تعمیر ہونے لگی، کہیں سے پتھر آیا تو کہیں سے لکڑی، جنات ہیکل سلیمانی کی تعمیر میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ ابھی تعمیر ہی ہو رہی تھی کہ موت نے نقارہ بجا دیا۔ حضرت عزرائلؑ اللہ کا پیغام لے کر آ پہنچے۔ حضرت سلیمان کے کان میں کچھ پھونکا اور دوسروں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے روح تو پرواز کر گئی، لیکن حضرت سلیمانؑ عصا کا سہارا لے کر اسی طرح کھڑے رہے۔ جنّات یہ سمجھتے رہے کہ حضرت سلیمانؑ زندہ ہیں اور ان کے کام کی نگرانی کر رہے ہیں۔ سالہا سال کام چلتا رہا، بے روح حضرت سلیمانؑ اسی طرح کام کی نگرانی کرتے رہے اور سارا معاشرہ بشمول جن و انس یہ سمجھتے رہے کہ حضرت سلیمانؑ تو ابھی زندہ ہیں۔ اسی دوران عصا کو دیمک لگ گئی اور رفتہ رفتہ اندر ہی اندر دیمک، عصا کو چاٹتی رہی۔ باہر سے لکڑی ثابت و سالم تھی، مگر اندر سے کھوکھلی ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ایک دن ایسا ہوا کہ دیمک نے عصا کو اندر سے کھوکھلا کر دیا اور عصا کے سہارے کھڑے ہوئے حضرت سلیمانؑ دھڑام سے گر پڑے۔ تب جا کر کہیں یہ سب کو پتہ لگا کہ حضرت سلیمانؑ زندہ نہیں تھے۔ بلکہ یہ تو

حضرت سلیمانؑ کا بے روح جسد خاکی تھا۔[1]

ہمارا ادب بھی حضرت سلیمانؑ کے اس قصے سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ یہ عمل صرف ادب کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ہر مکتب خیال کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے۔ جب اس طرح کا عمل پیدا ہوتا ہے تو اس کے ردعمل میں مسائل جنم لیتے ہیں اور ان مسائل کے ردعمل میں ان کا حل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ جدید ادب نہ صرف اپنے پڑھنے والے کے ذہن کو بدلتا ہے، بلکہ خواب دکھا کر عمل کی طرف بھی راغب کرتا ہے۔ یہ وہ ادب ہے، جس کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے۔ وہ زندگی جو لکھنے والے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ وہ زندگی جو ماضی میں بھی تھی، وہ زندگی جو آج بھی ہے اور وہ زندگی جو لکھنے والے کا بنیادی حوالہ ہے، وہ زندگی جس کے خواب اس نے اپنی تحریروں میں دیکھے اور اپنے پڑھنے والوں کو دکھائے یہی مستقبل کی زندگی ہے۔ جدید ادب یہی کام کرتا ہے اور ہمیشہ سے ایسا ہی کام کرتا آیا ہے۔ لیکن اگر ہم حضرت سلیمانؑ کے گرنے کا انتظار کرتے رہیں گے، تو جدید ادب قدیم اور بوسیدہ ہو جائے گا اور اس کو پھر سے جدید بنانے میں ایک مدت درکار ہوگی، تب تک دنیا بہت آگے نکل جائے گی۔ بقول ن۔م۔راشد ''سلیمان سربہ زانو اور صبا ویران''۔

جدیدیت کا یہ کام ہے کہ صبا کو ویران نہ ہونے دیا جائے، بلکہ اس کو اور بہتر یا پہلے سے بہتر بنایا جائے۔ کسی بھی معاشرے میں اگر ایک نظام خیال ٹوٹنے یا گرنے لگتا ہے، تو اس کے ٹوٹنے یا گرنے کی خبر اس معاشرے کے ادیبوں اور مفکروں کو پہلے سے ہی ہوتی ہے، اس لئے وہ اپنی تحریروں یا تقریروں کے ذریعے لوگوں کو پہلے ہی خبردار کرتے ہیں کہ بیدار ہو جاؤ، نیا کچھ آ رہا ہے۔ جہاں سارا معاشرہ آنکھ اور کان کھول کر بھی وہ چیزیں نہیں جان پاتا، مگر اس معاشرے کا ادب، اس کے بارے میں پہلے سے ہی واقف ہو جاتا ہے۔ جو معاشرہ آج یہ کہتا ہے کہ انگریزی

1: حضرت سلیمانؑ کا مذکورہ قصہ راقم نے ''ادب کلچر اور مسائل'' کے پہلے مضمون ''ادب اور فکر'' مصنف جمیل جالبی، ص ص ۱۱، ۱۲ سے اخذ کیا ہے۔

تعلیم غلط نہیں ہے۔ سرسید احمد خان اور اس کی تحریک کے علمبرداروں نے آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے انگریزی تعلیم کی افادیت کے بارے میں خبردار کیا تھا۔ اسی طرح ریل، بجلی، ترسیل کے نئے نظام سے جہاں سارا معاشرہ بیزار تھا، وہیں غالبؔ اس سے مستفید ہونے کی لوگوں کو تلقین کرتے تھے یا حالیؔ اور شبلیؔ جہاں تبدیلی کا ذکر کرتے تھے وہیں معاشرہ انہیں غلط نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مولانا حالیؔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

''پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں۔ یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے، جو آس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے رہ جائیگی۔ بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے۔ جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی پھرتا نظر آ رہا ہے''۔[1]

حالیؔ ادب کو نئے دور میں لے جانے کیلئے جدید بنا رہے تھے۔ وہ غزل کی اصلاح چاہتے تھے۔ انہوں نے پستی، لذت کوشی اور سطحی تفریح کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ مگر یہ اس وقت کے معاشرے کو پسند نہیں آیا۔ حالیؔ نے اپنے 'مقدمہ' میں شاعری کے لئے نئے پیمانے وضع کئے۔ اُن کے مطابق شعر کو از روئے انصاف علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔ شاعری سماج اور موجودہ حالات کی تابع ہونی چاہئے اور شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ ہو زبان سے، سمجھ سے، جوش سے بھرا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔ حالیؔ کے ان شعری پیمانوں نے غزل کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اگر یوں کہا جائے، تو غلط نہ ہوگا کہ حالیؔ نے اُردو شاعری خصوصاً غزل میں نئی روح پھونک دی۔ شاعری میں ایسا انقلاب آیا کہ شاعری حُسن کی رسمی دنیا سے الگ ہو کر، حقیقت پسندی کی طرف مائل ہوئی۔ مگر یہ باتیں ہم آج کہتے ہیں۔ اُس وقت حالیؔ کے ان پیمانوں اور اُن کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' کی زبردست مخالفت ہوئی۔ معاشرے کو حالیؔ کے وضع کردہ پیمانے پسند نہیں آئے۔ مگر حالیؔ خوب جان گئے تھے کہ عصا کو دیمک لگ چکی ہے۔ بلکہ

۱: مقدمہ شعر و شاعری، ص ۱۴۰۔

عصا ٹوٹ چکا ہے اور معاشرے کو اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

مولانا حالؔی کو جہاں آج کے معاشرہ میں ''دانائے وقت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، وہیں اُن کی دور بینی کو اپنے زمانے کا معاشرہ تنگ نظری اور تعصب سے تعبیر کر رہا تھا۔ بلکہ اُس معاشرے کے کچھ ادیب بھی اُن کی اس دور بینی کو تنگ نظری سے تعبیر کرتے تھے۔ حالؔی نے غزل کی مقبولیت کے مدنظر غزل کی ہی اصلاح کو ترجیح دی، جیسا کہ ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''اگر چہ حالؔی کا مقصد صرف غزل کی اصلاح تھا لیکن شاعر اور نقاد یہ سمجھتے تھے کہ حالؔی نے دل زندہ کی کہانی جس دن ختم کی، سب کے دل کی دھڑکنیں اُس دن بند ہو گئیں۔ عشق و محبت سوتے سو گئے۔ حُسن اور جوانی ابدی خزاں سے ہمکنار ہو گئی اور اس طرح غزل کا دور ختم ہو گیا''[1]

حالؔی غزل کا دور ختم نہیں کر دینا چاہتے تھے، بلکہ غزل میں، جو معاشرے کی ایک پسندیدہ چیز تھی، معاشرے کا ہی درد و غم سمو دینا چاہتے تھے۔ ابواللّیث صدیقی صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت کے کچھ تنگ نظر ادیب اور شاعر بھی حالؔی کی دور بینی سے خوش نہیں تھے۔ اس کا واضح ثبوت اُس زمانے کی لکھنو کے ادبی صحافت سے ملتا ہے۔ احمد علی شوق قدوائی نے اپنے ایک اخبار میں حالؔی کے خلاف بہت سارے مضامین شائع کئے۔ منشی سجاد حسین نے تو ''اودھ پنچ'' میں

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

کے عنوان سے دو سال نو ماہ تک مسلسل مضامین لکھے۔ مگر ان وقتی مخالفتوں کے دیرپا نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ حالؔی نے جو نئی دُکان کھول رکھی تھی، وقتی طور اُس کے خریدار بے حد کم تھے، مگر وقت

ا: غزل اور مغزلین، ص ۳۳۱۔

گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی اس الگ دُکان کی خبر چاروں اور پھیل گئی طرف آہستہ آہستہ گاہک بڑھتے گئے۔

حالؔی کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حزب اختلاف والے زندگی اور ادب کا نیا شعور نہیں رکھتے تھے اور وہ عالمی سطح پر ہونے والی ادبی سرگرمیوں سے بے خبر تھے اور حالؔی نے انہیں ان ادبی سرگرمیوں کی طرف راغب کروایا۔ یہ تبھی ممکن ہوسکا جب حالؔی کو ادب کیساتھ دلچسپی تھی اور ادب کو حالؔی جیسا ادیب ملا تھا۔ ادب اور حالؔی نے مل کر اُردو ادب کو جدید ادب کے زمرے میں داخل کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب معاشرے کے ظاہر و باطن کا آئینہ ہوتا ہے اور ادیب اس آئینے کے ذریعے قاری کو مستقبل اور معاشرے میں ہو رہی اُتھل پُتھل سے روشناس کراتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''ادب زندگی کا اظہار ہے، ادب معاشرے کے ظاہر و باطن کا آئینہ ہے۔ جو کچھ معاشرے کے باطن میں ہو رہا ہے، جو کچھ معاشرے پر گزر رہی ہے، ادیب کی تحریر اس کا احاطہ کرتی ہے۔ نیا احساس اور نیا شعور ادب کے وسیلے سے اجنبی بن کر داخل ہوتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ ہمارا دوست بن جاتا ہے''۔[1]

مذکورہ بالا اقتباس سے ادب کے دائرہ کار کا تعین تو ہو جاتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ جدیدیت یا جدید ادب کے مسائل اور امکانات کب جنم لیتے ہیں اور ہماری اصل بحث اسی سوال کے اردگرد گھومتی ہے؟ ویسے تو یہ توجیہہ پیش کی جاسکتی ہے کہ جب ادب کا کام زندگی کی ترجمانی ہے، تو زندگی ہر وقت موجود ہے۔ پھر جدیدیت کے جنم لینے کیلئے وقت یا صورت حال کے تعین کا سوال کیوں؟ اصل بات یہ ہے کہ ادب زندگی کا عکاس اور ترجمان ضرور ہے، لیکن اس کا کام زندگی اور اس کے مسائل کو جوں کا توں پیش کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہی وہ نکتہ ہے، جہاں ادب اور

۱: ادب، کلچر اور مسائل، مرتب (خاور جمیل)، ص ۱۳۔

صحافت کے بیچ حد فاضل کھینچ جاتی ہے۔ کسی بھی واقعے کی جُوں کی تُوں رپورٹنگ کرنا صحافت کے زمرے میں آتا ہے، نہ کہ ادب کے دائرہ میں۔ ادب جمالیات کے زمرے میں آتا ہے، اس لئے ادب صحافت سے ہٹ کر ایک الگ اور منفرد چیز ہے، جس کا کام الگ اور منفرد ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید ادب کا کیا کام ہے؟ اس کی وضاحت ڈاکٹر جمیل جالبی ذیل کے اقتباس میں یوں کرتے ہیں:

''ادب کا کام تو زندگی میں معنی تلاش کرنا ہے اور ان کا رشتہ ماضی سے قائم کر کے مستقبل سے جوڑ دینا ہے۔ ادب کا حوالہ تو خود زندگی ہے اور وہ اسی کو آگے بڑھاتا ہے۔ ادب تو انسانی تجربے کے مکمل علم و آگاہی کا نام ہے اور یہ علم و آگاہی وہ غیر معمولی مُرتب و منظّم صلاحیت ہے، جس کے اظہار کی صلاحیت صرف باشعور اور دردمند انسان کے پاس ہے۔ وہ انسان جو نہ صرف اس کے اظہار پر قدرت رکھتا ہے، بلکہ جس کا اظہار سچا بھی ہے اور حسین بھی، مکمل بھی ہے اور موثر و مثبت بھی۔ اسی لئے ادب تنقید حیات ہے اور زندگی کے گہرے پانیوں میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کا نام ہے''۔[1]

یہ اقتباس تو ادب کی بہترین ترانہ سنجی کرتا ہے۔ جدید ادب بھی اسی اقتباس کے زمرے میں آتا ہے۔ جدید ادب کا کام اصل میں زندگی میں نئے معنی تلاش کرنا ہی تو ہے۔ موجودہ زمانے میں جب کہ جدید اور قدیم ادب کے درمیان حد فاضل واضح ہو چکی ہے، قطعیت کے ساتھ جدید ادب کے نقطہء آغاز کا تعین ممکن نہیں ہے۔ ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیاں دفعتاً غیر متوقع طور پر وارد نہیں ہوتیں، بہت سارے نئے رجحانات غیر محسوس طریقے پر اُبھرتے اور نشو و نما پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک حد پر پہنچ کر ان کا وجود ایک مسلمہ حقیقت بن جاتا ہے۔

ا: ادب، کلچر اور مسائل، مرتب خاور جمیل، ص ۱۹۔

کبھی کبھی بعض نئے آثار آنے والی تبدیلیوں کے ظہور سے ان کی نشان دہی کر دیتے ہیں۔ روایت اور تجدد پسندی کی آویزش مسلسل جاری رہتی ہے۔ یہی آویزش جدیدیت کہلاتی ہے۔ مگر یہ بات بھی یاد رکھیں کہ کسی دور میں روایت کو زیادہ فروغ ملتا ہے اور کسی دور میں ادیب روایت کی بندشوں سے آزادی طلب کرتا ہے۔ یہ سب باتیں وقت کی ضرورت کے مطابق ہوتیں ہیں۔ تاہم اس آویزش و آمیزش کے نتیجے میں متصادم رجحانات میں اکثر ایک مبہم سی ''ڈھیلی ڈھالی'' مفاہمت بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہ مفاہمت ادبی تحریکوں میں انتہا پسندانہ رجحانات کی آخری منطقی نتیجے تک پہنچنے سے روک لیتی ہے اور اس طرح روایت اور جدت کے درمیان آمیزش برقرار رہتی ہے، ایک رخ ماضی کی روایات کی جانب اور دوسرا رخ مستقبل کے امکانات کی جانب رہتا ہے اور اس طرح نہ ماضی سے رشتہ کٹ جاتا ہے اور نہ مستقبل کی جانب پیش قدمی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، پروفیسر احتشام حسین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''جدید کسی آج کے ذہین ناقد یا فن کار کی دریافت نہیں ہے، کیونکہ ہر قدیم کا جدید ہوتا رہا ہے اور ہر عہد کا فنکار اس سے اپنے شعور کے مطابق سمجھتا رہا ہے۔ لیکن کچھ لوگ اسے نقطہء آغاز بھی سمجھتے ہیں اور حد آخر بھی۔ ایسے لوگوں کا شعور تاریخی نہیں تخیلی اور زمانی ہے۔ جو لوگ جدیدیت کو ایک مسلک اور ایک عقیدے کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں، وہ بدلے ہوئے حالات کا ذکر تو کرتے ہیں، لیکن وقت اور تاریخ کے مادی (اور اس کے ذریعہ ذہنی) اثرات کو اہمیت نہیں دیتے۔ ان کیلئے جدیدیت ایک مطلق، قائم بالذات شخصی اور باطنی کیفیت ہے۔ لیکن جو لوگ جدیدیت کو ایک تاریخی لزوم کی حیثیت سے ارتقاء کی ایک منزل قرار دیتے ہیں، ان کے لئے یہ تبدیلی کے وسیع عمل کا ایک جُز ہے، جو کسی اور تبدیلی کیلئے فضا کو ہموار کر

رہا ہے، جو کسی گزری ہوئی تبدیلی کا نتیجہ ہے اور کسی آنے والی تبدیلی کا سبب''۔[1]

ان معنوں میں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جدیدیت ایک مسلسل عمل ہے، جسے ہم نے پہلے باب میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اب ضرورت اس بات کو سمجھنے کی ہے کہ جدیدیت کے مسائل اور اُن مسائل کا حل کیا ہے؟ جو ایک پیچیدہ مسلہ ہے۔ ان پیچیدگیوں کو آسان کرنے کیلئے ادب کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہی وہ راستہ ہے، جو ہمیں جدیدیت، ادب سے اسکا تعلق، ادب میں اس کی ضرورت وغیرہ جیسے مسائل اور ان مسائل کے حل کی جانب لے جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید ادب کا کام کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جدید ادب چاروں اطراف پھیلی ہوئی اس زندگی کے مسائل کو المیے کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود یونان کی زندہ اساطیر، سوفو کنیز کا ''ایڈی پس'' اور ارسطو کا ''کتھارسس'' آج بھی اس کی زندہ مثالیں ہیں جدید ادب ان برسوں پرانے شاہکاروں کو مسترد نہیں کرتا، بلکہ انہیں مزید فروغ دینے میں مدد کرتا ہے، تا کہ آنے والی نسل ان سے مستفید ہو۔

سارا عالمی ادب اُٹھا کر دیکھیں، تو ہمیشہ وہی شہ پارہ کلاسکس کا حصہ بنا ہے، جو نہ صرف معاشرے سے جڑا ہوا ہے، بلکہ جس نے معاشری مسائل کو المیے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ بات دلچسپ اور قابل غور ہے کہ کلاسکس تخلیق کرنے والے اکثر ادیبوں نے معاشرتی بحران کے عہد میں ہی جنم لیا ہے۔ تمام عالم کا ادب ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ غالبؔ کے فکری ماخذ، میرؔ کی درد وغم سے بھرپور شاعری، ٹالسٹائی کا ''وار اینڈ پیس'' (War and Peace)، اقبال کا علم الکلام، دوستوفسکی کا ''جرم و سزا''، منٹو کے شاہکار افسانے، محی الدین حاجنیؔ کی ''گاڈِہ ہانژنی''، حبہ خاتون کی درد بھری شاعری، پریم چند کے عظیم افسانے وغیرہ، یہ تمام شاہکار اپنے عہد کی بحرانی کیفیت ہی کی پیداوار ہیں۔ یہ بحرانی کیفیت سیاسی، سماجی، اخلاقی اور ادبی کسی بھی

ا: سہ ماہی، ''فنون''، لاہور، غزل نمبر، ۱۹۶۹ء، مرتب احمد ندیم قاسمی، ص ۲۳۰۔

سطح پر ہوسکتی ہے۔غرض یہ کہنا مقصود ہے کہ کسی بھی سطح کا بحران اچھے واعلیٰ ادب اور ایک حقیقی فن کار کے لئے بہترین تخلیقی لمحہ ہوتا ہے اور اکثر قوموں کا تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی انتظار ہی اعلیٰ ادبی شہ پارے کے جنم کا سبب بنا ہے۔

اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ موجودہ زمانے میں ادب کے کیا مسائل ہیں؟ اور ان کا سدباب کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی اس بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''آج کی جدید زندگی میں سائنس پر غیر معمولی زور ہے۔سائنس نے اشیاء کو ہمارے شعور میں داخل کردیا ہے، لیکن فکر واحساس کو زندگی سے نکال باہر کیا ہے اور اسی وجہ سے اس وقت ساری دنیا ایک ہولناک عدم توازن کا شکار ہے۔زندگی ساری ترقیوں اور حیرت ناک ایجادات وانکشافات کے باوجود معنویت وتوازن سے عاری ہے۔اسی لئے ساری دنیا اس وقت ایک ایسے نظامِ خیال اور تصور حقیقت کی تلاش میں ہے، جس سے انسان اپنے وجود کو بامعنی بنا سکے۔یہ کام ادب کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے''۔[1]

اس اقتباس میں موصوف نے تین اہم چیزوں کا انکشاف کیا ہے۔ایک یہ کہ آج کی اس جدید زندگی میں سائنس داخل ہو چکا ہے، دوسرے ساری دنیا ہولناک عدم توازن کا شکار ہے، تیسرے انسان کا وجود بے معنی ہو چکا ہے اور اس کو خطرہ لاحق ہے، انسان کا جب وجود ہی خطرے میں ہو تب انسانیت خطرے میں ہے اور جس کا وجود محفوظ ہو اُس کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔جمیل جالبی نے وجود کو بچانے کے لئے، ادب کا سہارا لیا ہے۔اُن کے بقول ادب کے ذریعے ہی انسان اپنے آپ کو بامعنی بنا سکتا ہے اور جدید ادب ہمارے وجود کو محفوظ رکھنے کیلئے یا بچانے کے لئے ایک الگ نظام خیال یا فلسفہ پیش کرتا ہے۔جس کو ہم ''وجودیت'' کے نام سے جانتے ہیں۔

ا: ادب، کلچر اور مسائل، مرتب (خاور جمیل)، ص ۱۸۔

فرد اپنی ذات میں ایک مستقل وجود ہے، جو عقلی اور غیر عقلی عوامل سے تشکیل پاتا ہے۔ آزادی انسانی فطرت کا ایسا جوہر ہے جو اپنا وجود کہیں باہر سے حاصل نہیں کرتا۔ بلکہ آزادی وجود کی ہی پیداوار ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے، اُس وقت وہ مکمل آزاد ہوتا ہے، مگر یہ آزادی دیر پا نہیں رہتی۔ اُس کا وجود تو آزادی کا متلاشی ہوتا ہے، مگر سماج اس آزادی کو پسند نہیں کرتا۔ وحید اختر وجودیت کی وضاحت کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

''وجودیت کہتی ہے کہ ہمیں اس کائنات کو بامعنی بنانے کیلئے، زندگی کو مقصدیت عطا کرنے کیلئے، اپنی فکر کا آغاز وجود سے ہی کرنا چاہئے۔ ہر فرد کو اپنے وجود اور اس کے مسائل کا براہ راست جو تجربہ حاصل ہوتا ہے، یہی معتبر اور یقینی تجربہ ہے۔ اسکے مقابلے میں وہ تمام ذرائع علم پایہ اعتبار کے لحاظ سے ضعیف ہیں۔ اس نقطے سے چل کر ہم کائنات میں انسان کے منصب، عمل اور مقصد کو سمجھ سکتے ہیں''۔[1]

وجودیت ہمیں کائنات میں انسان کے منصب کے بارے میں واقفیت بہم پہنچاتی ہے۔ مگر اسکے بجائے جدیدیت ہمیں انسان کا منصب کائنات میں دکھاتی ہے اور کہتی ہے یہ انسان کا منصب ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وجودیت یا اس طرح کے دوسرے رجحانات اس سکے کی مانند ہے، جس کا ایک حصہ بے کار ہے اور جدیدیت اس سکے کی مانند ہے جس کے دونوں حصے کارآمد ہیں، جبکہ وجودیت ہو یا جدیدیت، مسلہ یہ ہے کہ انسان کیلئے یہ کیا کر سکتے ہیں۔ یہ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو ادب کی حدود کے اندر رہ کر ہی کر سکتے ہیں۔ بقول جمیل جالبی: ''یہ کام ادب کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے''۔ موجودہ دور میں ادب اور ادیب دونوں کو مسائل کا سامنا ہے۔ دور حاضر کے سنگین مسائل ہمارے لئے ایک چیلنج ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر جس طرح برق رفتاری سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، ان کے اثرات براہ راست

۱: جدیدیت اور ادب، مرتب (آل احمد سرور)، ص ص ۵۸، ۵۹۔

ہمارے سماج اور تہذیب خصوصاً ادب کو متاثر کر رہے ہیں۔ ان اثرات کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور ان کی معنویت اور افادیت پر سوالیہ نشان لگائے جا رہے ہیں۔ ایسے حالات میں ادیبوں کو خلوص اور ایمانداری کے ساتھ سماج کے تئیں اپنے فرائض انجام دینے چاہیں۔ عصر حاضر کے ادیبوں اور ادب کو جن مسائل کا سامنا ہے، وہ اتنے پیچیدہ ہیں کہ تاریخ کے کسی موڑ پر ادیبوں کو ان سے نبرد آزما نہیں ہونا پڑا۔ لہٰذا موجودہ دور کے ادباء کو اپنی بصیرت سے کام لے کر ادب میں درپیش مسائل کے سدباب کیلئے لائحہ عمل مرتب کرنا پڑے گا۔

اُنیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنسی عطیہ بھاپ کی طاقت تھی۔ بیسوی صدی ایٹمی توانائی کی صدی کہلائی اور ایٹم بم کی تخریبی طاقت سے حیات انسان کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی دلدوز تباہی سے انسانی ذہن بُری طرح جھنجھوڑ اُٹھا۔ گزشتہ تین چار دہائیوں میں سائنسی ترقی کی بدولت تہذیب وسماج کے سانچوں میں ایسی حیران کُن تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، جن کی بدولت ہزار ہا برس کے انسانی تہذیبی سفر پر سوالیہ نشان کھڑے کر دئے گئے ہیں، ان چند دہائیوں میں انسان نے مادی ترقی کی بے شمار منزلیں طے کیں، مگر ساتھ ہی اپنی شاطر اور دیوانہ یا مجنونانہ حرکتوں یا گندی ترکیبوں سے اس حسین دنیا کو کئی مرتبہ نیست ونابود کیا ہے۔ افغانستان، عراق، ویتنام، جاپان، فلسطین وغیرہ اس کی کچھ مثالیں ہیں۔ انسان کا اپنے وجود اور سماج کو خوب سے خوب تر بنانے کا خواب خاک میں مل چکا ہے۔ آج انسان ہی انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ فطرت کی خوفناک قوتوں پر فتح حاصل کرنے والے انسان نے انسان کے تقدس کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد ہی دنیا میں ایسی برق رفتار تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ ایک حساس شخص آج کل زندگی کے دوراہے پر حیران وپریشان کھڑا ہے۔

انسان نے سائنس کی بدولت جہاں چاند پر کمندیں ڈالیں، وہیں وہ مریخ پر جانے کی

کوشش میں مصروف عمل ہے۔خلاء کی لامحدود وسعتوں میں قدم رکھنے کے بعد انسان کے تخیل کی وسعتیں بھی خلاء کی وسعتوں کی طرح لامحدود ہو گئیں ۔آج انسان کے بنائے ہوئے مصنوعی سیارے خلا میں قدرت کے اسرار کی نقاب کشائی کرنے میں مصروف ہیں۔دوسری جانب زمین پر تیز رفتار گاڑیوں اور ہوائی جہازوں نے جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔اس کے علاوہ ٹیلیفون،موبائل فون، ٹیلی ویژن،کمپیوٹر اور انٹرنیٹ وغیرہ انفارمیشن تیکنالوجی کی ترقیوں کے بدولت ان نئی سہولتوں نے ماضی کی اس پر اسرار دنیا کو ایک چھوٹے سے گاؤں (Global Village) میں تبدیل کیا ہے۔جغرافیائی سرحدوں کے ٹوٹنے سے تہذیبوں کے مابین باہم میل جول کے بجائے انتشار اور کشمکش کی ایک عجیب وغریب صورت پیدا ہو گئی ہے۔

نئی نئی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اپنے خطرناک عزائم کی بدولت پوری دنیا کو ایک تجارتی منڈی میں تبدیل کر دیا ہے۔انہوں نے پسماندہ ممالک کی تجارت پر قبضہ جمار کھا ہے اور اپنی مصنوعات کی فروخت کیلئے فحاشی اور عریانیت کا وہ سیلاب رواں کیا ہے کہ مشرقی اقدار و تصورات کے سانچے ریت کے گھروندوں کی طرح مسمار ہو رہے ہیں اور جو باقی بچے ہیں اُن کے مستقبل کی کوئی ضمانت نہیں۔اس عمل میں ماس میڈیا اور پرنٹ میڈیا دونوں بھرپور تعاون دے رہے ہیں۔

اسی طرح میڈکل سائنس کی نت نئے ایجادات نے انسان کو حیران کر کے رکھ دیا ہے۔ جراحی کا عمل تو بے حد مفید تھا مگر اب طبی سائنس نے بانجھ پن کو ختم کرنے کیلئے سیمن بنک (Semen Bank) کا قیام عمل میں لایا ہے۔جینٹک انجینئرنگ (Genetic Engineering) کی بدولت جانوروں کے بعد اب انسانوں کی متوقع کلوننگ نے ہزار ہا برس میں قائم ہونے والی تہذیبی معیاروں کو ہلا کر رکھ دیا ہے،ان ایجادات نے انسانی رشتوں پر بھی سوالیہ نشان قائم کئے ہیں۔

ان کے علاوہ ماحولیاتی آلودگی کے سبب انسانی ذہن بے حد متاثر ہو چکا ہے۔ کاسمو پولیٹن کلچر (Cosmo Politine Culture) بڑے شہروں میں تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ نوجوان اپنی ذہنی نا آسودگی کی وجہ سے افیون، چرس، شراب، ذہن کو سکون دینے والی ادویات کے علاوہ سائبر اسپیس (Cyber Space) کا سہارا لیتے ہیں۔ مشترکہ خاندان کا تصور پاش پاش ہو چکا ہے۔ اندرونی اور بیرونی فرقہ پرستی اور دہشت گردی نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو پاش پاش کیا ہے۔

مندرجہ بالا مسائل اور نہ جانے کتنے اور مسلے ہیں، جنہوں نے دور حاضر کے ادب کو جھنجوڑ کے رکھ دیا ہے۔ جدید ادب کو ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرنی ہے اور جدید ادیب کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سماج کے سامنے زندگی کا ایک توانا اور صحت بخش تصور پیش کرے۔ دورِ حاضر کے مسائل کے تئیں ادیب کو حقیقت پسندانہ نظریہ اختیار کرنا ہے اور معاشرے کی گھٹن اور اضطراب میں نئی امید کا چراغ جلانا ہے۔ جدید ادیب کو حالات کا جائزہ لے کر اپنی راہ کا تعین خود کرنا ہے اور سیاست کا آلہء کار بننے کے بجائے اس کی رہنمائی کرنی ہے۔ اس طرح جدید ادیب کو ذاتی مفادات سے بلند ہو کر انسان کی فلاح وصلاح کے جذبے کے تحت کام کرنا ہے۔ پروفیسر محمد فضل الرحمٰن اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لئے زندگی کی طرح اس میں بھی انقلابات اور تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نہ صرف موضوع اور مواد میں، بلکہ ہیت و اسلوب میں بھی تبدیلیاں ناگزیر ہیں اور ان تبدیلیوں کیلئے ہر دور کے ادیب اور قاری کو اپنے اندر آمادگی پیدا کرنی ہوگی۔ لیکن اس سلسلے میں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ باوجود انقلابات اور تبدیلیوں کے ادب میں ایک تسلسل بھی ہوتا ہے۔ ادب میں تبدیلیاں روایت کی بنیاد پر ہی ہوتی ہیں، بالکل خلاء میں ان کا تصور نہیں

کیا جا سکتا۔ جدیدیت اگر فطری مرحلے سے گزر کر آئے گی تو ادب میں فنی اور جمالیاتی قدریں برقرار رہیں گی اور ایسا ادب دیرپا حیثیت کا حامل ہوگا ورنہ دوسری صورت میں یہ جدیدیت بہت جلد پُرانی ہو جائے گی''۔[1]

اس اقتباس میں موصوف نے ادب کو زندگی کا آئینہ وار قرار دیا ہے۔ جب ادب زندگی کا آئینہ ہو تو اس میں یقینی طور پر تبدیلیاں بھی ہونگیں، اسلئے ادیب کو چاہئے کہ وہ ان تبدیلیوں کے لئے اپنے آپ کو تیار کرے اور خود کو روایت میں غرق ہونے سے محفوظ رکھے اور قاری کو بھی چاہئے کہ وہ ایسے ہی ادب کو پسند کرے، جو عصری معیاروں پر پُورا اُترتا ہو۔

دُنیا میں ہونے والی تبدیلیاں ادب پر براہ راست اثر انداز ہو رہی ہیں، آج کا قاری ان تبدیلیوں سے پوری طرح واقف ہے۔ اس کی وجہ الیکٹرانک میڈیا ہے، اس لئے جدید ادیب کو چاہئے کہ وہ اپنے ادب میں موجودہ دور کا خیال رکھے۔

یہ جاننا ضروری ہے کہ اصطلاحی معنوں میں لفظ جدیدیت کو کتنے مسائل درپیش رہے ہیں یا آرہے ہیں۔ جدیدیت ایک مسلسل عمل ہے۔ جدیدیت کیا ہے؟ اسکے مسائل اور امکانات کیا ہیں؟ اس سلسلے میں احسان نظر اور اعجاز سوری نے ایک سروے (Survey) کی تھی۔ جو بڑی ہی محنت سے تیار کی گئی تھی۔ سروے ۳۵ سوالات پر مشتمل ہے اور ان سوالات کے جوابات کے سمجھنے کیلئے جدولوں (Tables) اور نقشوں (Scales) کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس سروے کا ایک بڑا فائدہ یہ مل گیا کہ یہ دونوں حضرات خود غیر جانبدار رہے۔ انہوں نے خود جدیدیت کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم نہیں کی ہے۔ بلکہ انہوں نے ہندوستان کے مشہور ادباء کے ہی مشوروں سے استفادہ کیا ہے اور ان کی رائے کو جدولوں اور نقشوں کے ذریعے قاری تک

۱: یہ اقتباس علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر جناب محمد فضل الرحمن کے خطبہ افتتاحیہ سے لیا گیا ہے۔ (مشمولہ) جدیدیت اور ادب، (مرتب: پروفیسر آل احمد سرور)، ص ۱۰۔

پہنچایا ہے، یہ ایک ایسی کوشش ہے جس کو ہم عملی کام کا نام دے سکتے ہیں۔

احسان نظر اور اعجاز سوری نے 'جدیدیت' کے سوالوں کے جوابات کو فی صد کے حساب سے الگ الگ جدولوں میں تقسیم کر کے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

جدیدیت کیا ہے؟ سروے کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ جدیدیت نہ کوئی تحریک ہے، نہ ہی شہرت پانے کا ذریعہ اور نہ ہی مریضانہ ذہن کی تشہیر کا آلۂ کار ہے۔ بلکہ جدیدیت ایک رجحان ہے اور ۹. ۳۷ فی صد ادباء نے یہی جواب دیا ہے کہ یہ ایک رجحان ہے، خالی ۳. ۴ فی صد ادباء نے کہا تھا کہ اس کی مخالفت ہونی چاہئے۔ ۹. ۸۶ فی صد ادباء نے مشورہ دیا ہے کہ تبدیلی اور تغیر انسانی فطرت کے اہم جزو ہیں اور جدیدیت کے معنی تبدیلی اور تغیر کے ہی ہیں۔ اس سروے کے مطابق ۸۴ فی صد ادباء نے جدیدیت کو سمجھنے اور قبول کرنے کی کوشش پر زور دیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جدیدیت وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس سے ہمیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے، تاکہ نئی نسل اس سے مستفید ہو سکے۔

اس سروے میں دئے گئے سوالات اور ان کے جوابات کا اگر ہم تناسب نکالیں تو اس میں سے ۷۰ فی صد نے اقرار کیا ہے کہ جدیدیت نے ادب میں اضافہ کیا ہے یا جدیدیت ادب کے لئے ضروری ہے یا ہمیں اپنے ادب کو جدید بنانا چاہئے یا جدیدیت کی حمایت کرنی چاہئے۔ گویا ۳۰ فی صد وہ لوگ ہیں جو جدیدیت کی حمایت نہیں کرتے ہیں مگر ان ۳۰ فیصدی میں سے ۱۳ فیصد ایسے ہیں جو 'تضاد' میں مبتلا ہیں۔ اب بچے ۱۷ فیصد جو جدیدیت کی حمایت نہیں کرتے، اس مسلے کو دور کرنے کیلئے میں یہاں کہنا چاہتا ہوں کہ اس ۱۷ فیصد میں عمر کا بھی تقاضا ہے۔ اس لئے یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جدیدیت تمام مسائل کے باوجود ادب اور زندگی کو بہتر بنانے کیلئے ایک بہترین رجحان ہے۔

جہاں تک ہم نے پہلے باب سے یہاں تک سمجھا ہے، تو وہ یہی حقیقت ہے کہ جدیدیت ایک مسلسل عمل ہے، ایک اضافی چیز، جدیدیت کا ایک تاریخی تصور ہے، ایک فلسفیانہ تصور اور ایک ادبی تصور، جدیدیت مطلق نہیں بلکہ مسلسل چلنے والی ہے۔ اگر میر تقی میرؔ میں کوئی جدت نظر آئی تو جدیدیت نے اُس کی اُن صلاحیتوں کو باہر نکالا اور دنیا کو بتایا کہ میرؔ عوام سے گفتگو کرنا چاہتے تھے اور میرؔ کے اُس ذہن کو بھی سلام کرتے ہیں، جس نے میرؔ کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ ''بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات'' اسی طرح جدیدیت غالبؔ کو بھی جدید بناتی ہے، اُس کو رد نہیں کرتی، بلکہ غالبؔ کے اُس شعر و ادب کا خیر مقدم کرتی ہے، جس میں نیا پن ہے۔ جدیدیت حالیؔ ،سرسید، سرسید تحریک، شبلی نعمانی کی رومانیت، حالیؔ کی افادیت، اکبرؔ کے طنز، نظیر اکبر آبادیؔ کی جاندار شاعری، پریم چند کی دیہات کی طرف توجہ، ادب کی بے رنگ دنیا کے رنگین بادشاہ منٹو، ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوقؔ ،رومانیت، وجودیت، جدیدیت بحیثیت تحریک، مابعد جدیدیت، مابعد جدیدت کے بعد (Post post Modernity) سب کا خیر مقدم کرتی ہے، اگر اس نے روایت کو رد نہ کیا ہو اور نئے کو گلے سے لگایا ہو، تو جدیدیت اُس ادب کو رد کرتا ہے، جو روایت کو رد کرتا ہو، جدیدیت اُس ادب کو بھی رد کرتا ہے، جس نے روایت کو ہی گلے لگایا ہو، جدیدیت اُس ادب کو رد کرتا ہے، جو جدت کو رد کرتا ہو۔ جدیدیت اُس ادب کو بھی رد کرتا ہے، جس نے بس خالی جدت کو ہی گلے لگایا ہو۔ جدیدیت اُس کو گلے لگاتی ہے، جس میں روایت اور جدت کی آویزش و آمیزش ہو۔ جدیدیت کبھی بوڑھا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں زمانی بُعد (Generation Gap) کا اثر ہوتا ہے، بلکہ یہ کشادہ نظری کا فلسفہ ہے۔ اس کی مثال ہم اس طرح دے سکتے ہیں کہ آل احمد سرورؔ ترقی پسندوں میں پیش پیش تھے اور بہت سے جدید ادیبوں کی بہ نسبت بزرگ تھے، لیکن جب جدید تحریک کا آغاز ہوا تو وہ زمانی بُعد کا شکار نہیں ہوئے، بلکہ

اُن کا شمار جدیدیت کے ہراول دستے میں ہوتا رہا اور انہوں نے جدیدیت کی ترقی میں کہیں کتابوں کو مُرتب کیا اور خود بھی بہت سارے مضامین لکھے، تا کہ جدیدیت کو فروغ حاصل ہو۔ اسی طرح خلیل الرحمٰن اعظمی، شمس الرحمٰن فاروقی، بشیر بدر، گوپی چند نارنگ وغیرہ وغیرہ وہ لوگ ہیں، جو کبھی ترقی پسندی کے ساتھ تو کبھی جدید تحریک کے ساتھ اور کبھی مابعد جدیدت کے ساتھ وابستہ رہے، مگر جدیدیت ان کو رد نہیں کرتی، بلکہ ان کے کام میں نکھار پیدا کرتی ہے اور یہ لوگ ادب میں نکھار لاتے ہیں، اسلئے ایک ادیب کو چاہئے کہ وہ زمانی بُعد کا شکار نہ ہو جائے، بلکہ اپنے لئے ایسا راستہ تیار کریں کہ آنے والا کل اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچے، نہ کہ اس کو رد کریں۔

جدیدیت ایک وسیع اور ہمہ گیر تصور ہے۔ یہ ہر اُس چیز کو اپنے اندر سماتا ہے، جس میں تغیر ہو اور جمود کو تغیر پر اُکساتا ہے۔ سرسید تحریک کے محرکات مقامی و مذہبی تھے۔ ترقی پسند تحریک کے محرکات بین الاقوامی، سیاسی اور غیر مذہبی تھے۔ وجودیت کا نعرہ صرف فرد کی انفرادیت تھی۔ رومانیت کا نعرہ صرف تبدیلی مگر ایسی، جس کے ذریعے مستقل نظام ٹوٹ جائے اور تمام کلاسیکی خیالات درہم برہم ہو جائے۔ کلاسیک کا نعرہ صرف روایت کی تقلید، حلقہ ارباب ذوق کا نعرہ صرف ادب، ان تمام کا اپنا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے کہ کس طرح ادب کو فروغ ملے مگر ان کے اپنے نظریے کے مطابق ہوتا ہے، خواہ یہ نظریہ مذہبی، سیاسی، سماجی، ادبی وغیرہ کا ہو۔ مگر جدیدیت اس سے مختلف ہے۔ یہ کوئی تحریک نہیں، بلکہ ایک رجحان یا میلان ایک ایسا مسلسل عمل جس نے بخلاف ترقی پسند تحریک کے یا اور کسی تحریک کے نہ کوئی باضابطہ منشور جاری کیا نہ کوئی تنظیم بنائی، نہ عہدہ دار مقرر کئے نہ آئے دن قرارداد پاس کئے، نہ مخالفین کو برادری باہر کیا۔ جدیدیت ایک کشادہ ذہنی رویہ ہے، ایک متنوع اور تکثیری نظریہ ہے۔ یہ ایک بت ہزار شیوہ ہے۔

جدیدیت کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کیلئے اتنی مثالیں ملتی ہیں یا اتنے مضامین لکھے گئے ہیں جن

میں مضمون نگاروں نے اپنے اپنے نظریہ کے تحت اس کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، جس کی وجہ سے جدیدیت کیلئے مسائل پیدا ہو گئے، کیونکہ جدیدیت کا اپنا کوئی ایجنڈا نہیں ہے، نہ یہ کوئی تحریک ہے۔ اس لئے یہ سب کے نظریوں کو قبول کرتی ہے، اگر اس کے حق میں ہو تو۔ مگر ان مختلف النوع مضامین نے قاری کیلئے مسائل پیدا کئے ہیں کہ وہ کس نظریے کو قبول کریں یا یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ جدیدیت کو سمجھنے کیلئے سروے کرنی پڑی، جس کے ذریعے یہ تو پتا چلا کہ جدیدیت تحریک نہیں بلکہ ایک رجحان ہے۔ مگر یہ مسلہ پیدا ہوا کہ اس رجحان کے بارے میں کس کا نظریہ صحیح ہے۔ اگر میں کہوں جدیدیت ایک کشادہ ذہنی رویہ ہے، تو اس حساب سے تمام نظریہ درست، چاہئے وہ آل احمد سرورؔ کا ہو یا پھر مظفر حنفی کا ہو، اپنے اپنے طریقے سے سب کے نظریے درست ہیں، مگر پھر بھی مسلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کس کے نظریہ پر عمل کریں۔ ان میں سے کچھ نظریوں کو دیکھیں اور ان پر غور کریں کہ یہ ناقدین کس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں۔

یہ غور و فکر ہم پہلے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے ایک سرگرم نقاد سے کرتے ہیں۔ دیکھیں ان کے خیالات جدیدیت کے بارے میں کیا ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرورؔ:

''جدیدیت صرف انسان کی تنہائی، مایوسی، اس کے اعصاب زدگی کی داستان نہیں ہے۔ اس میں انسان کی عظمت کے ترانے بھی ہیں۔ اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں انسانی دوستی کا ایک جذبہ بھی ہے، مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آئیڈیالوجی سے بیزاری، فرد پر توجہ، اس کے نفسیات کی تحقیق، ذات کا عرفان اس کی تنہائی اور اس کی موت کے تصور سے خاص دلچسپی''۔[1]

1: نظر اور نظریے، آل احمد سرور، ص ۱۷۹۔

اب اس نقاد کی رائے جانیں، جو کبھی کہتا ہے جدیدیت ٹھیک ہے، کبھی کہتا ہے کہ مابعد جدیدیت اصل نظریہ ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ:

''جدید ادب کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ یہ ادب کی ادبی بحالی کیلئے کوشاں ہے۔ اس ادب کا کارنامہ تو یہی ہے کہ فن کار کا تخلیقی عمل خارج کے احکام کا تابع نہیں، بلکہ ادب ذاتی اور سماجی سچائی کا موضوعی اظہار ہے، اسلئے ادب میں بنیادی اہمیت ادبی اقدار کی ہے''۔[1]

ایک رائے یہ بھی پیش کی جارہی ہے کہ گوپی چند نارنگ صاحب اسلئے مابعد جدیدیت کی اکثر باتیں کرتے رہتے ہیں کیوں کہ وہ اردو ادب میں حالی بننا چاہتے ہیں۔ یعنی میں نے بھی ایک نظریہ پیش کیا۔ میری نظر میں یہ نظریہ نہیں بلکہ اپنا مقام بنانے کیلئے ایک حربہ ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی:

''جدیدیت تمام فلسفوں اور نظریوں کے حدود کو توڑنے کا نام ہے۔ ناوابستگی ہی اس کی وہ خصوصیت ہے، جو اس سے پچھلے تمام ادبوں سے ممتاز کرتی ہے۔ گزشتہ ادب سے اگر اس کا سلسلہ کہیں ملتا ہے، تو وہ وہیں جہاں ادیب نظریے اور فلسفے سے بالاتر ہوگیا ہے''۔[2]

۱: قصۂ قدیم وجدید، ص ۱۱۔

۲۔ جدیدیت اور ادب، ص ۱۲۔

بشیر بدر:

''جدیدیت وہ داخلی تشکیک، جو ایمان کو بھی ری ایکزامن (Reexamine) کرنے پر مجبور کردے''۔[1]

ڈاکٹر وزیر آغا:

''جدیدیت کا زمانہ دراصل ایک خلاء کا دور ہوتا ہے یعنی اس میں اقدار و آداب کی سابقہ روایت کے خاتمے کے بعد کوئی نئی روایت ابھی پوری طرح متشکل ہو کر سامنے آنے سے گریزاں ہوتی ہے''۔[2]

قاضی سلیم:

''جدیدیت ایک ادبی رویہ بھی ہے اور ادیبوں کا ایک مسلک بھی''۔[3]

پروفیسر محمد حسن:

''جدیدیت مختلف الخیال اور مختلف عقائد شعرا سے عبارت ہے۔ جدیدیت میرے نزدیک معاصرانہ حقیقتوں میں نئی بصیرت اور معنویت کی تلاش ہے''۔[4]

۱۔ ماہنامہ شب خون، جلد ۶، شمارہ ۶۶، مدیر عقیلہ شاہین، نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۵۷۔

۲۔ جدیدیت نئے تناظر، ص ۵۸۔

۳۔ جدیدیت تجزیہ و تفہیم، ص ۵۳۵۔

۴۔ جدیدیت تجزیہ و تفہیم، ص ۵۷۲۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''جدیدیت کا تصور، ادبی تنقید کی اصطلاح میں صرف تاریخ تک محدود نہیں، وہ تو ایک زندگی اور اس کے بدلتے ہوئے معاملات و مسائل سے تعلق رکھتا ہے''۔[1]

وحید اختر:

''جدیدیت کی مختصر ترین تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور اس سے تمام خطرات و امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ ۔۔۔۔۔۔۔جدیدیت ایک ایسا مستقل عمل ہے، جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ہر عہد میں ان لوگوں نے جو حقیقی طور پر زندہ رہے ہیں، اس عمل میں حصہ لیا ہے۔ انہوں نے فکر و فن کی سطح پر فرسودہ اقدار کے خلاف جنگ کر کے نئی قدروں کی پرورش کی اور عملی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے''۔[2]

ڈاکٹر مغنی تبسم:

''جدید کی اصطلاح عام طور پر زمان اور وقت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے مطابق کل کا جدید آج کا پُرانا ہو جاتا ہے''۔[3]

۱۔ نگارِ پاکستان، جدید شاعری نمبر، ص ۱۴۶۔

۲۔ جدیدیت اور ادب، ص ۲۹۔

۳: جدید غزل، ص ۳۵۔

یوسف جمال خواجہ:

''جدیدیت ایک مخصوص رویہ یا تصور کے مفہوم میں ابدی کہلایا جاسکتا ہے۔اس کا تعلق ناظر کے زمانی رشتوں کے ساتھ محدود نہیں ہوتا''۔[1]

مندرجہ بالا نظریے دراصل جدیدیت کی کشادہ دامنی کا ثبوت ہے جو ہر ایک نظریے کو قبول کرتا ہے۔مختلف النوع نظریات سے واقف ہوکر ہم جدیدیت کے مسائل تک جاسکتے ہیں اوران کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔

انیسویں صدی تو کب کی چلی گئی اور بیسویں صدی کو بھی ہم چھوڑ آئے۔اکیسویں صدی میں ہم جی رہے ہیں اگر ہمیں اس صدی میں اچھی طرح زندہ رہنا ہے تو ہمیں اس صدی کے مسائل کا سامنا بھی کرنا ہوگا۔یہ صدی پچھلی تمام صدیوں سے مختلف ہے۔اس صدی میں چلنا نہیں بلکہ دوڑنا ہے تبھی جاکر انسان کوئی منزل پاسکتا ہے۔

اکیسویں صدی فضا اور آسمانوں کو تسخیر کرنے کی صدی ہوگی۔اس صدی میں نت نئے علوم کا بول بالا ہوگا۔اس صدی میں نئی تعلیمی،سماجی اور اقتصادی قوتیں ابھر رہی ہیں۔جمہوریت کے دوش بدوش خواجگی بھی نت نئے لباس میں جلوہ گر ہے۔اکیسویں صدی میں سائنس اور تیکنالوجی ایک نئے عہد میں داخل ہورہی ہے نینوتیکنالوجی (Nano-technology) نے انسانی ذہن کو دھنگ کررکھا۔لوگ نیوتیکنالوجی کو پسند کرنے لگے ہیں۔اشیاء کو مختصر بنانے کا عمل تیز ہو رہا ہے۔نینوتیکنالوجی دراصل ایک بین مضامین شعبہ ہے،جس میں علم طبعیات،علم کیمیا،علم حیا تیات،ریاضی اور انجینرنگ کے اصولوں کا عمل دخل ہے۔اگر یہ ایک بین مضامین شعبہ ہے تو

۱۔ جدیدیت اور ادب،ص ۳۰۔

ہوسکتا ہے کہ آنیوالے وقت میں اس کا عمل دخل ادب پر بھی ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ''نینو ادب'' زیادہ کارآمد ثابت ہوجائے۔ جس طرح آج کل لوگ نینوتیکنالوجی کو پسند کرتے ہیں، ہوسکتا ہے اسی طرح کل تک 'نینو ادب' پسند کریں اور جدیدیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اگر کوئی اچھی چیز سامنے آتی ہے تو اس کا خوش آمدید کیا جائے، تاکہ اس سے مستفید ہوسکیں۔

اکیسویں صدی میں خبروں اور علم کی ترسیل کا ایک نیا سلسلہ قائم ہوگیا ہے۔ کرۂ ارض ہزاروں میل پر پھیلی ہوئی انسانی آبادی عالمی گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ سائنس اور تیکنالوجی کی روز افزوں ترقی نے شہروں کی دوریاں کم کردی ہیں۔ کرۂ ارض کے دور دراز علاقوں میں رونما ہونی والے واقعات کی خبریں اور تصاویر چند لمحون میں ٹیلی ویژن کے پردے پر نمودار ہوجاتی ہیں۔ ہزاروں میل دور سے اشخاص کی خیر و عافیت چشم زدن میں دریافت کی جاسکتی ہے۔ انٹرنیٹ اور ای۔میل (E-mail) کی بدولت مطلوبہ کتاب کا مطالعہ گھر بیٹھے کیا جاسکتا ہے۔ اعداد شمار کو کمپیوٹر میں فیڈ کرنے کا ہنر گزشتہ صدی دے گئی ہے۔ سپر پاور طاقتیں چاند پر نو آبادیاں قائم کرنے میں کوشاں ہیں۔ آج کا انسان گزشتہ صدی کی بہ نسبت زیادہ حساس اور باشعور ہے۔ ہمارا معاشرہ نت نئے مسائل سے دوچار ہے۔ شکست وریخت کے عمل سے ہمارا ادب بھی محفوظ نہیں۔

آج کا انسان جہاں ایک طرف خلاؤں کی تسخیر میں لگا ہوا ہے، وہی دوسری طرف اس سے روحانی طور خلاء کا مسلہ بھی درپیش ہے۔ جب وہ ذہنی طور اور روحانی طور مسائل میں مبتلا ہے، تو پھر اُس کو دنیا کے عیش و آرام سے کیا مطلب۔ ایسے عالم میں بس ادب ہی خلوت اور جلوت میں اس کی غم خواری کرسکتا ہے۔ نئی صدی میں تخلیق کاروں کو انسان کے ازلی اور ابدی سر چشموں اور عصری آگہی کی طرف خاطر خواہ توجہ دینی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اس سے حیات و

کائنات کے راز ہائے سربستہ کو بھی آشکار کرنا ہوگا۔ نئی صدی کے ادیب و نقاد کو ادب و شعر کی پرکھ کیلئے نئے پیمانے وضع کرنے ہوں گے اور تخلیقی ادب میں منتشر اصولوں کے از سر نو شیرازہ بندی کی جائے گی۔ ساتھ ہی ان کا تجزیہ بھی پیش کیا جائے گا۔

زبان کی سطح پر تقیل اور نامانوس الفاظ کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ مختلف زبانوں اور ادب کے رابطہ کے نتیجے میں ایک نئی زبان تشکیل پا رہی ہے۔ شعر و ادب کے پیمانے بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔ اب آسان، عام فہم اور سلیس زبان کو شعر کے قالب میں ڈھالنے میں اولیت دی جائے گی، بول چال کی سطح پر اردو غزل اور ہندی غزل کی شناخت کرنا مشکل ہے۔ یہی صورت حال قریب قریب نثر کا کی بھی ہے۔ نئی صدی میں مختلف زبانوں کے ادیب اور شاعر گذشتہ صدی کی بہ نسبت ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں۔ انسانی قافلہ ایک نئی راہ پر رواں دواں ہے، اس کے ساتھ ہی آج کا انسان، ذہنی انتشار، لاسمتی اور غیر یقینی کی فضا سے دو چار ہے۔ جس کی آہٹ ادب و شعر میں بھی محسوس کی جا رہی ہے۔ نئی صدی کا فنکار کرۂ ارض سے غربت، جہالت، ناخواندگی، دہشت گردی، لسانی مصیبت اور اقتصادی غلامی کے خلاف آواز بلند کرے گا۔ نئی صدی میں اُسی ادب کو مقبولیت حاصل ہوگی، جو انسانیت، دردمندی، اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل ہوگا۔ غزل کو وہی مقام حاصل رہے گا، مگر فنکار عروض سے رشتہ توڑ دے گا۔ چھوٹی نظموں، قطعات، رباعیات، ناولٹ، مختصر افسانے پر زیادہ توجہ دی جائے گی۔ عدیم الفرصتی کے باعث افسانچوں کی افادیت اور بڑھ جائے گی۔ دہشت گردی، بدعنوانی، لسانی عصبیت کے خلاف لکھے جانے والے ادب کو مقبولیت حاصل ہوگی۔

نئی صدی میں ظلم و تشدد سے نبرد آزما ہونے اور مظلوموں کی حمایت کا ولولہ اپنی تخلیقات کے ذریعے پیدا کرنا ہوگا۔ مختصراً اس صدی میں ادب گزشتہ صدی کے مقابلے میں زیادہ مسائل سے

دوچار رہے گا۔ اسلئے جدید صدی کے جدید ادب کو کارآمد بنانے کیلئے جدید ادیبوں کو ان مسائل کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ خواہ کتنے ہی مسائل سامنے کیوں نہ آئیں مگر اُن کے حل کیلئے غالبؔ کے اس قول کے مصداق جدید ادیبوں کو واضح کرنا ہوگا کہ

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں